Osaka University Knowledge Archive

| | |
|---|---|
| Title | POLITICAL AND HISTORICAL EVENTS AND THOUGHTS IN URDU POETRY BEFORE1707 A.D. |
| Author(s) | Kashfi, Al-Khayr Abu |
| Citation | 大阪外国語大学学報. 29 p.469-p.496 |
| Issue Date | 1973-02-28 |
| oaire:version | VoR |
| URL | https://hdl.handle.net/11094/80495 |
| rights | |
| Note | |

*Osaka University Knowledge Archive : OUKA*

https://ir.library.osaka-u.ac.jp/

Osaka University

# POLITICAL AND HISTORICAL EVENTS AND THOUGHTS IN URDU POETRY BEFORE 1707 A. D.

Abu al-Khayr Kashfi

Although Urdu became the popular medium of poetic and literary expression in northern India after 1707, yet before that date we can see the reflection of political, historical and cultural events in the mirror of Urdu poetry; particularly in Daccani poetry. (Urdu language developed in the sovereign states of the South, especially Goalkunda and Bijapur, is called Daccani.)

Kabir's poetry (15th century) is an evidence of Islam's impact on Indian culture and thought. His protest against the caste system, his belief in man's equality and his faith in oneness of God are the products of Islamic influence. Other important poets of the North are Qutban and Afzal.

Historically it is not true to say that Nationalism is a polical theory or ism born in Europe during the 18th and 19th centuries. It can be traced back in the poetry of the Persian poet Firdausi; and its salient features are very prominent in Daccani Urdu poetry of the period before 1707 A. D.

Daccani Urdu played an important role in developing this nationalism. On one hand Daccan's armies were fighting against the Moghal army, and on the other hand her poets were singing the songs of Daccan's separate identity.

Apart from language and geography, religion also was a factor in the formation and developmcnt of this nationalism. The Daccan monarchs were Shia Muslims while the Moghal emperor was Sunni Muslim. However, in the case of a conflict between nationalism and religion, the former emerges as a stronger force.

In the present study the Daccani poetry has been analysed from this angle. The cultural aspects, festivals, celebrations and religious ideas of the period, as recorded by the Daccani poets, have also been presented.

# اردو شاعری میں سیاسی و تاریخی واقعات
## ۱۷۰۷ء سے پہلے

از ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

اورنگ زیب کی وفات ایک طرف تو بر عظیم کی تاریخ میں ایسے موڑ کا درجہ رکھتی ہے جب ہمارے سیاسی اقتدار کا سورج نصف النہار پر پہنچنے کے بعد مغرب کی طرف سفر کرنے لگا اور دوسری طرف ۱۷۰۷ء کے بعد سے اردو بازاروں اور محفلوں سے گزر کر شعر و سخن کی دنیا میں ذریعۂ اظہار بننے لگی۔ لیکن اس سے پہلے بھی اردو شاعری کے آئینہ خانے میں ہمیں سیاسی، تاریخی، تمدنی اور ثقافتی واقعات و کوائف کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار کے افکار کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ تاریخ کے وسیع تر مفہوم میں کسی قوم یا گروہ کے انداز فکر اور طرز زیست کا مطالعہ شامل ہے۔ تاریخ اپنی بلند تر سطح پر تمدن و ثقافت کے سر چشموں اور ارتقا کی نشان دہی کرتی ہے۔

بعض ادبی مورخوں نے ہماری شاعری کی روایت کا آغاز "پرتھی راج راسا" سے کیا ہے، لیکن یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کی تصنیف نہیں ہے۔ حافظ محمود خان شیرانی مرحوم نے اس باب میں مستحکم دلیلیں پیش کی ہیں، مثلاً بعض بیانات غلط ہیں جیسے شہاب الدین کے بھائی کا نام یا اس میں ان آتشیں اسلحوں کا ذکر ملتا ہے جن کا رواج کئی صدیوں بعد ہوا۔(۱)

امیر خسرو سے جو کلام منسوب ہے اس پر ہمارے محقق لسانی اعتبار سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ یا امیر خسرو کی شخصیت اور جامعیت کے سلسلہ میں اسے موضوع بحث بنایا جا سکتا ہے، لیکن ان کے ریختہ میں ہمارے نقطۂ نظر سے کوئی قابل ذکر مواد نہیں۔

کبیر داس[۲] کی شمولیت بھی لسانی اعتبار سے بحث طلب ہو سکتی ہے کہ ان کی زبان کو اردو کہا جائے یا نہیں۔ کبیر نے اپنی بولی کو اکثر مقامات پر "پوربی" کہا ہے، لیکن اس میں "برج بھاشا، کھڑی بولی، پنجابی، راجستھانی سبھی کے الفاظ ملتے ہیں"۔[۳] اسی طرح ان کی زبان میں بہاری اثرات بھی موجود ہیں۔ مجموعی طور پر کبیر کی زبان اور اسلوب کو اردو کے ارتقا کا ایک مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کبیر کی شاعری میں تاریخی واقعات کا راست ذکر تو نہیں ملتا، لیکن بعض دوہوں میں ان واقعات کا احساس اور زندگی کے حقائق کی سنگینی پس منظر کے طور پر نظر آتی ہے۔

ہیرا تہاں نہ کھولئے جہاں کھوٹی ہے ہاٹ

کس کر باندھو گاٹھری اٹھ کر چالو باٹ

---

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے

دوئی پٹ بھیتر آئی کے ثابت گیا نہ کوئے

کبیر کی شاعری کا مطالعہ ایک اور اعتبار سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور وہ ہے ان کی شاعری اور فکر پر اسلام کا اثر۔ کبیر موحد ضرور تھے، لیکن مسلمان نہیں تھے۔ اس کی شہادت کے طور پر ان سے منسوب بے شمار دوہے پیش کئے جا سکتے ہیں، اور خاص طور پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ وہ آواگون (تناسخ) کے قائل تھے، لیکن اسلامی تعلیمات نے انہیں ایک طرف توحید کے تصور تک پہنچایا اور دوسری طرف وہ انسانی مساوات سے آشنا ہوئے۔ ذات پات کے خلاف ان کا شاعرانہ احتجاج، اسلام کے اسی ابر کرم کی چند بوندوں کا عطیہ ہے جو بر عظیم پر صدیوں تک برسا ہے اور جس کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں۔ ذات پات کے بارے میں کبیر کے دوہے بہت مشہور ہیں۔ انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ توحید سے متعلق ایک دوہا نقل کیا جاتا ہے۔

صاحب میرا ایک ھے دوجا کہا نہ جائے
دوجا صاحب جو کہوں صاحب کھرا رسائے

کبیر کے افکار پر اسلام کے اثرات کا اعتراف کرتے ھوئے پنڈت منوھر لال زتشی نے لکھا ھے۔

"کبیر صاحب پر کیا موقوف ھے، اسلام کے عقائد اور اسلام کی مثال کا اثر ھندوؤں پر شمالی ھند میں عالم گیر تھا۔ مسٹر مہادیو گوبند راناڈے کی رائے ھے کہ شمالی اور جنوبی ھندوستان میں ھندوؤں کے بعض رسم و رواج میں بین فرق نظر آتا ھے، خصوصاً شودروں اور اچھوتوں کے ساتھ شمالی ھند میں جو کم سختی برتی جاتی ھے اس کی ایک وجہ یہ ھے کہ شمالی ھندوستان میں اسلام کا اثر گہرا اور دیرپا تھا"۔(۴)

قطبن بھی پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام اور سولھویں صدی عیسوی کے آغاز کے شاعر ھیں۔ ان کے دور اور ان کے سرپرست کے بارے میں محققین میں اختلاف ھے، لیکن حافظ محمود خان شیرانی کا تحقیقی قیاس یہ ھے کہ ان کا سرپرست "علاالدین شاہ والیٔ بنگالہ ھوگا جس نے ۱۴۹۳ء (۸۹۹ھ) سے ۱۵۱۸ء (۹۲۵ھ) تک حکومت کی ھے"۔(۵) قطبن کی مثنوی مرگاوتی، پدماوت کے انداز کے ایک عشقیہ قصے پر مبنی ھے، لیکن اس میں شاہ حسین کا حوالہ تاریخی اھمیت رکھتا ھے۔

شاہ حسین آھے بڑا راجہ  چھتر سنگا سن ان کو چھاجا
پنڈت او بدھ دنت سیانا  پڑھے پور ان ارتھ سب جانا

عہد مغلیہ سے پہلے ادبی ذریعۂ اظہار کے طور پر شمالی ھند میں اردو زبان نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی تھی۔ اردو عوامی سطح پر اس درجہ مقبول ھو چکی تھی کہ

"جنگ پانی پت ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں جب بابر نے سلطان براھم لودھی کو

شکست دی تو کسی نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھے۔

نو سے اوپر تھا بتیسا　　پانی پت مین بھارت دیسا

اٹھئین رجب سکر وارا　　بابر جیتا ، براھم ھارا "(۶)

دکھنی ادب کا جائزہ لینے سے پہلے افضل جھنجھانوی کا ذکر مناسب ھوگا۔ افضل کا سال وفات ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۶ء) ھے۔(۷) افضل کے بارہ ماسہ مین شوھر کی جدائی مین ایک عورت کی کیفیات کو پیش کیا گیا ھے۔ بارہ ماسہ اس امر کی شہادت ھے کہ عورت کی زبانی عشقیہ کیفیات و جذبات کی عکاسی اس عہد مین شمالی ھند اور دکن دونون کے شعری ادب کی مشترک خصوصیت ھے اور اس کا سرچشمہ ھندی شاعری ھے۔ بر عظیم کی پرانی شاعری مین عشقیہ جذبات کا اظہار اکثر عورت کی طرف سے کیا گیا ھے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ھاشمی کے علاوہ کسی اور دکھنی شاعر کی شاعری کو ریختی کہنا شاید مناسب نہین ، کیونکہ ریختی ھمارے ادب مین مختلف اصطلاحی معانی رکھتی ھے اور ایک ایسی جداگانہ صنف ھے جو اپنی خصوصیات کے ساتھ بعد کی چیز ھے، جس پر آگے چل کر گفتگو کی جائےگی۔

افضل کے بارہ ماسہ کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ھو سکےگا۔

نہ مجھ کو سوکھ دن ، نہ نیند راتا　　برھون کی آگ مین سینہ جراتا

اری یہ عشق ھے یا کیا بلا ھے　　کہ جس کی آگ مین سبھ جگ جلا ھے

وھی جانے کہ جس کے تن لگی ھے　　برھون کی آگ تن سن مین لگی ھے

بارہ ماسہ یا "دوازہ ماھہ " مین بر عظیم کے بارہ مہینون کی خصوصیات و کیفیات کا احاطہ کیا گیا ھے۔ مثلاً ساون مین کوئل کی کوک فراق زدہ عورت کے تن بدن مین بارش کے چھینٹون کے ساتھ ساتھ برہ کی آگ کو بھڑکا دیتی ھے۔

اری جب کوک کوئل نے سنا ھی　　تمام تن بدن مین آگ لاھی (کذا)

دکھنی شاعری مین ۱۷۰۷ء سے بہت پہلے سیاسی واقعات کو پیش کرنے کی

روایت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کی ادبی وجہ تو مثنوی کا فروغ ہے، لیکن خود مثنوی کا فروغ سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ ہے۔ دکن کے سلاطین نے اپنی زبان کی سرپرستی کی۔ شعرا کی قدر افزائی کی مسلسل مثالیں پیش کیں۔ ان میں سے کئی خود بھی شاعر تھے۔ سلاطین دکن اور ان کے درباروں سے متعلق شاعروں کے کلام میں ان کی شخصی زندگی اور حالات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور تمدنی حالات و واقعات کی تصویر کشی اور ترجمانی بھی نظر آتی ہے۔ اس شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس میں "قومیت" کے عناصر اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ قومیت کا جذبہ اس شاعری میں آنکھیں کھولتا نظر آتا ہے۔

مغرب کی سیاسی اور ذہنی غلامی کے نتیجہ کے طور پر ہم ہر تحریک یا نظریہ کا منبع مغرب کو قرار دینے لگے ہیں۔ "قومیت" کو انیسویں صدی عیسوی کا ایک سیاسی نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ قومیت کے ارتقا یافتہ تصور کے پیش نظر یہ دعویٰ شاید کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے کہ قومیت ایک "تازہ خدا" ہے، لیکن ادبیات کا مطالعہ اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ اپنے جدید تصور کے اعتبار سے بھی فردوسی قومیت کا پہلا نقیب ہے۔

نہ شیر شتر خوردن و سو سمار عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تخت کیان را کند آرزو تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

فردوسی کی اس قومیت کا ایک نمایاں پہلو اس کی لسانی عصبیت ہے جس کا زندہ ثبوت شاہ نامہ ہے۔ "زبان" کو آج قومیت کا عنصر ہی نہیں کہا جاتا بلکہ بعض مفکرین کے نزدیک یہ قومیت کی اساس ہے۔ قومیت کے عناصر کے ایک سرسری سے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکھنی ادب میں "قومیت" آج کے مروجہ مفہوم میں بھی موجود تھی۔ قومیت کے جغرافیائی، لسانی، جذباتی اور مذہبی عناصر کی کارفرمائی دکھنی ادب میں موجود ہے۔

مغرب کے مفکرین نے قومیت کی تاریخ اور عناصر کو جس طرح سمجھا اور پیش

کیا ہے اس کے مطابق یورپ کے شاہ الثانیہ کے دور میں قومی اختلافات ابھرنے لگے تھے، اور قرون وسطیٰ میں رومیوں کا جو نصب العین وحدت موجود تھا وہ بکھرنے لگا تھا۔ پندرھویں صدی سے یورپ کی مقامی بولیاں ادبی زبانیں بننے لگیں اور مختلف گروہوں کے مشترکہ رسم و رواج، مفادات و روایات نے یورپ کے لوگوں کو الگ الگ قوموں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوں قومیت مغرب میں ایک نیم شعوری احساس اور جذبہ کی حیثیت سے اٹھارھویں صدی کے آخر تک رہی۔ اسے ۱۷۷۲ء میں پولینڈ کی تقسیم کے موقع پر ایک سیاسی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا۔(۸)

کچھ مصنفوں نے اس وحدت پر زور دیا ہے جو نسل، زبان اور اداروں کی یکسانیت سے حاصل ہوئی۔ Fichte نے زبان کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس نے ۸-۱۸۰۷ء میں جرمن قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "لوگوں کی قومی شیرازہ بندی زبان سے ہوتی ہے"۔(۹) عہد حاضر کے مصنف تاریخ کے مطالعہ، نظریۂ ارتقا اور سماجی نفسیات کے زیر اثر سیاسی نظام اور حب وطن کی بنیاد پر حاصل شدہ روحانی وحدت کے اس تدریجی ارتقا پر زیادہ زور دیتے ہیں جو مشترکہ تجربوں اور روایات کا نتیجہ ہوتا ہے۔(۱۰)

قومیت کو ایک جدید سیاسی نظریہ قرار دینے کے ساتھ ساتھ مغرب کے سیاسی مفکر اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی جڑیں بہت دور تک تاریخ میں پیوست ہیں، قبیلہ، منظم کاشتکاری، سیاسی اور تنظیمی مسائل سے لے کر مختلف ریاستوں کے قیام تک۔ اور ان ریاستوں میں ان کے الگ وجود کا احساس ان کے سپاہیوں نے پیدا نہیں کرایا بلکہ ادیبوں اور شاعروں نے۔ قومیت کے ارتقا میں اس کا سب سے بڑا ہتھیار اور وسیلہ زبان رہی ہے۔ ادیبوں اور فن کاروں نے قومیت کے دیو کو ذہن کی بوتل سے جس طرح نکالا ہے اس کا اظہار، باربرا وارڈ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"When in the eighteenth century,Nationalism began to take form as a modern movement,its forerunners in many parts of Europe were

not soldiers and statesmen but scholars and poets who sought to find in ancient legends and half forgotten folksongs the 'soul' of the nation".(11)

دکن کی تاریخ اور دکھنی ادب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف دکن کے سپاہی مغلوں کے خلاف لڑتے رہے اور دوسری طرف دکن کے شاعروں نے نیم فراموش شدہ داستانوں میں نہیں بلکہ اپنے سپاہیوں کے کارناموں اور اپنے بادشاہوں کے سوانح میں ایک قوم کی "روح" کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ دکن کا ذکر ایک مستقل اور علیحدہ ملک کی حیثیت سے بار بار کیا گیا۔ دکن کے علاوہ جو کچھ ہے وہ "مغلائی" ہے یعنی مغل سلطنت۔ قومیت کی وفاداریوں کا دائرہ اور حلقہ بہت محدود ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال نصرتی کی شاعری ہے۔ اس نے علی نامہ میں اپنی شکستوں کو بھی فتح میں بدل دیا ہے۔ قومیت تاریخ کو یوں ہی مسخ کرتی ہے اور اپنی بنیادوں پر ایک ہی ریاست اور جغرافیائی وحدت کے رہنے والوں کو تقسیم کرتی ہے۔ دکن میں بھی ہمیں یہ تقسیم نظر آتی ہے۔ حکیم شمس اللّٰہ قادری نے مورخ فرشتہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سلطنت بہمنیہ کے "مسلمان" تک تین گروہوں میں تقسیم کئے گئے تھے۔ ۱= دکنی۔ وہ لوگ جو علاالدین خلجی کے عہد میں یا اس کے کچھ بعد جا کر دکن میں آباد ہوئے۔ ۲= غریب یعنی ترکستان، ایران اور افغانستان کے لوگ جن کی زبان فارسی تھی، اور ۳= حبشی۔ یہ لوگ عربی کے علاوہ اپنی زبان بولتے تھے۔(۱۲) فرشتہ کی اس تقسیم کے ذکر کے بعد ہی قادری صاحب نے اس تقسیم کے لسانی پہلو کی وضاحت بھی ان الفاظ میں کر دی ہے کہ "غریبوں کے مقابلہ میں دکنیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اسی اعتبار سے عربی اور فارسی کے مقابلہ میں ان کی زبان کو بھی ملک میں بہت زیادہ رواج حاصل تھا"۔(۱۳)

ان عناصر کے علاوہ دکنی قومیت کی تشکیل میں مذہب کو خاصا دخل حاصل ہے۔ سلاطین دکن زیادہ تر شیعہ تھے۔ ان کے مسلک کو سرکاری مذہب کی

حیثیت حاصل تھی۔ غلو کا یہ عالم تھا کہ بارہ امامون کی نسبت سے اگر ایک طرف بارہ پیاریون کا ذکر ہوتا تھا اور محل مین بارہ برج بنائے جاتے تھے تو دوسری طرف سنیون کو "خارجی" کہا جاتا اور ان کو "راہ راست پر لانے" کی کوشش سرکاری سطح پر کی جاتی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ضمن مین اس پہلو کو مثالون کے ذریعہ پیش کیا جائےگا۔ قومیت اور دکنی ادب کے بارے مین ان چند معروضات کے بعد سیاسی اور تاریخی نقطۂ نظر سے دکھنی شاعری کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ عہد بہمنی (۱۳۵۰ء تا ۱۵۲۵ء) مین تین لسانی علاقے مہاراشٹر، تلنگانہ اور کرناٹک ایک وحدت بن گئے۔ اس سیاسی وحدت کے استحکام مین دکھنی اردو نے بھی بڑا حصہ لیا۔ یون شمالی ہند اور دکن مین اردو کی شکل و صورت مین بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر زور نے اپنے ایک مضمون مین اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔(۱۴)

"جب ۱۳۴۷ء مین بہمنی سلطنت دولت آباد مین قائم ہوئی اور دکن اور شمالی ہند سیاسی حیثیت سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تو اردو بھی دو حصون مین تقسیم ہو گئی"۔(۱۵)

دکھنی زبان کے کئی مرکز قائم ہوئے۔ گلبرگہ، بیدر، گوگی، ویلور اور گول کنڈہ وغیرہ۔ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز اسی عہد سے تعلق رکھتے ہین۔ معراج العاشقین کو آج بھی صحت اور یقین کے ساتھ ان کی تصنیف نہین کہا جا سکتا، لیکن نثری ادب ہمارے موضوع مین شامل نہین۔ بہر حال ان کی شاعری (ہدایت نامے، چکی نامے وغیرہ) زیادہ صحت کے ساتھ ان سے منسوب کی جا سکتی ہے۔ اس طرح دکھنی اردو مین بھی ہماری شاعری نے تصوف اور رشد و ہدایت کے سائے مین آنکھ کھولی۔

نظام شاہ بہمنی ۱۴۶۰ء مین تخت نشین ہوا۔ نظامی بیدری، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا مصنف اسی عہد کا شاعر ہے۔ مثنوی کی روایت بہمنی عہد سے شروع ہو

گئی۔ اس کا ایک سبب تو دربار کی سرپرستی تھا اور دوسرا سبب معاشی خوش حالی کو قرار دیا جا سکتا ھے۔

بہمنی سلطنت کے خاتمہ پر دکن مین مسلمانون کی پانچ ریاستین قائم ھوئین۔ ان مین سے اردو ادب و شعر کی تاریخ مین بیجاپور کی عادل شاھی اور گول کنڈہ کی قطب شاھی حکومت کو بڑی اھمیت حاصل ھے۔ یہ دونون ریاستین قریب قریب "ھم عمر" ھین۔ عادل شاھی ریاست ۱۴۹۰ء مین وجود مین آئی اور قطب شاھی عہد ۱۵۰۸ء سے شروع ھوا۔ اس لئے مناسب یہ ھوگا کہ ان کا الگ الگ مطالعہ کیا جائے۔ اس ضمن مین یہ بات بھی قابل ذکر ھے کہ بعض شاعران دونون درباروں سے متعلق رھے۔ بیجاپور سے گول کنڈہ یا گول کنڈہ سے بیجاپور چلے جانا عام بات تھی۔ پھر دونون خاندانون کے درمیان شادی بیاہ کا سلسلہ بھی قائم ھوا۔

عادل شاھی عہد (۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک)

یوسف عادل شاہ نے محمود گاوان کی شہادت کے بعد بہمنون کے خلاف بغاوت کر کے "علاقہ کرناٹک کے مرکزی شہر بیجاپور مین ایک آزاد سلطنت قائم کر دی"۔(۱۶)

اس خاندان کے حکمرانون مین ابراھیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) علم و فضل کا بڑا سرپرست تھا۔ نورالدین ظہوری، ملارفیع الدین شیرازی، ابوالقاسم فرشتہ وغیرہ اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ "ظہوری نے بادشاہ کی ھندی کتاب نورس کا وہ اھم دیباچہ لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ھے"۔(۱۷) شاہ برھان الدین جانم اسی دور سے تعلق رکھتے ھین۔ ھمارے نقطۂ نظر سے اس عہد کی سب سے اھم شخصیت "عبدل" ھے۔ اس شاعر نے ۱۶۰۳ء مین مثنوی ابراھم نامہ نظم کی۔ اس مثنوی مین بیجاپور کے عام حالات، ماھرین فنون کے تذکرے اور دربار شاھی کے مرقعے موجود ھین۔ ابراھم نامہ کا نمونہ جناب نصیرالدین ھاشمی نے "دکن مین اردو" مین خاصی تفصیل سے پیش کیا ھے۔

محمد عادل شاہ کا دور ۱۶۲۶ء سے ۱۶۵۶ء تک کا ھے۔ اس کی مان گول

کنڈہ کے سلطان محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی اور اس دور میں گول کنڈہ کے دربار کے کئی متعلقین بیجاپور آئے اور یہاں کی ادبی تاریخ میں مشہور ہوئے۔ قطب رازی، مرزا مقیمی، امین، مرزا دولت شاہ، ظہور بن ظہوری، حسن شوقی، رستمی، صنعتی اور ملک خوشنود اس عہد کے ممتاز شاعر ہیں۔ مرزا مقیمی نے مثنوی چندر بدن و ماہیار میں ایک ہندو شاہزادی اور مسلمان تاجر زادہ کا عشقیہ قصہ لکھا ہے جس کی تمدنی اہمیت ہے۔

حسن شوقی پر مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ شوقی کا شاعرانہ مرتبہ ایسا تھا کہ ابن نشاطی نے پھول بن میں اس کا ذکر کیا ہے۔

حسن شوقی اگر ہوتا فی الحال　　ہزاران بھیجتا رحمت منج اپرال

شوقی کی نظم میزبانی نامۂ سلطان محمد عادل شاہ سے اس عہد کے ایک تمدنی گوشہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کی دوسری اہم نظم "فتح نامۂ نظام شاہ" ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظام شاہیوں سے متعلق رہا اور پھر "یا تو نظام شاہی حکومت کی تباہی پر یا کسی اور وجہ سے اس کا تعلق وہاں سے قطع ہو گیا اور وہ عادل شاہی دربار میں آ گیا"۔(۱۸) فتح نامہ میں رام راج کے مارے جانے اور وجیانگر کی سلطنت کے خاتمے کا ذکر ہے۔ اگر یہ نظم الحاقی ہے تو بھی اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے کسی اور شاعر نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے، کیونکہ لسانی اعتبار سے یہ اسی عہد کی کاوش ہے۔ علاوہ ازیں اس نظم سے نظام شاہ، علی عادل شاہ اور قطب شاہ کے اتحاد کا پتہ بھی چلتا ہے۔ دکن کو اس عہد کے دکھنی شاعروں نے کم و بیش ہر موقع پر ایک الگ اور مستقل "ملک" کہا ہے اور اسے دوسرے ملکوں پر ترجیح دی ہے۔

خراسان کے شاہان ہیں شمشیر بند　　روہیلۂ پٹھانان و گزری کمند
عرب ہور عجم ملک لڑنے کو زور　　وہ راہل جیتے راج ہیں درز چور
سو افضل میانا ہے ملک دکن　　ہوئے یان کے شاہان جیتے خوش لکھن

(کذا)

علی عادل شاہ ثانی شاہی (۱۶۵۶ء تا ۱۶۷۳ء) جدید تحقیقات کے مطابق اچھا شاعر تھا۔ اس کا اردو کلیات سید مبارزالدین رفعت اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر چکے ھین۔ عادل شاھی سلطنت کے زوال کے آثار محمد عادل شاہ کے عہد ھی سے نظر آنے لگے تھے۔ ایک طرف مرھٹے تھے اور دوسری طرف مغل فوجون کا محاصرہ۔ علی عادل شاہ نے کبھی مرھٹون کو رفیق بنایا اور کبھی مرھٹون سے میدان کارزار مین الجھا۔ انھین معرکون مین پنالہ کا معرکہ بہت مشہور ھے۔ "شیوا جی نے راست مقابلہ نہ کیا۔ چپکے سے پنالہ کا قلعہ چھوڑ دیا۔ اسی موقع پر سلطان علی کے درباری شاعر ملک الشعرا نصرتی نے "علی نے پل مین پنالہ لیا صلابت سون" والا مشہور مصرع کہا تھا"۔(۱۹) صلابت کے ذکر کی وجہ یہ ھے کہ صلابت خان شیوا جی سے مل گیا تھا۔

اس بادشاہ کا دور بڑا ھنگامہ خیز رھا۔ اورنگزیب سے "شاھی" کو صلح کرنی پڑی اور اس صلح کے بدلے مین اسے بیجاپور کا کم و بیش تمام شمالی علاقہ عالم گیر کو دینا پڑا۔

شاھی کے اردو کلیات (جو داخلی شہادتون کی بنا پر اس کا قرار دیا گیا ھے) مین اس کے محلون کی تعریف مین جو قصیدے شامل ھین ان کا مقابلہ محمد قلی قطب شاہ اور عبد اللّٰہ قطب شاہ کے اسی موضوع پر قصائد سے کیا جا سکتا ھے۔ شاید ھم یہ تو نہ کہہ سکین کہ "شاھی کے قصائد ان سے بہتر ھین"،(۲۰) لیکن ان قصائد کی فنی خوبیون کا اعتراف کرنا پڑےگا۔

شاھی مذھباً شیعہ تھا، لیکن "دکنی قومیت" کے جذبے کے تحت اس نے حضرت خواجہ گیسو دراز سے بھی عقیدت کا اظہار کیا ھے۔ کلیات شاھی مین "مثمن درمدح حضرت سید محمد حسینی خواجہ گیسودراز" موجود ھے، حالانکہ شیعہ حضرات کو تصوف سے کوئی دلچسپی نہین ھوتی۔ اس مدح کا سبب قومیت کا وھی تصور اور نظریہ معلوم ھوتا ھے جس پر سطور بالا مین گفتگو کی جا چکی ھے۔

علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعرا نصرتی تھا۔ نصرتی کو اردو کے عظیم شعرا کی صف میں شامل کرنا ہر لحاظ سے مناسب اور قرین حق ہے۔ نصرتی کی دو مثنویوں "گلشن عشق" اور "علی نامہ" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ہمارے موضوع کا تعلق "علی نامہ" سے ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنی کتاب "نصرتی" میں اس مثنوی پر صفحہ ۸۰ سے ۲۱۸ تک مفصل بحث کی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "نصرتی کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب، بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔۔۔ یہ رزمیہ مثنوی ہر لحاظ سے ہماری زبان میں بے نظیر ہے"۔(۲۱) مولوی صاحب کی رائے بڑی حد تک درست ہے، لیکن جیسا کہ انہوں نے اپنی طویل بحث میں بعض مقامات پر کہا ہے، نصرتی عادل شاہی دربار سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اپنی شکست کو بھی فتح قرار دیتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات صحیح ہے کہ نصرتی مغلوں سے نفرت کے باوجود ان کی شجاعت کی تعریف بھی کرتا ہے اور اس کے یہاں رزمیہ مناظر شمالی ہند کے مرثیوں کی طرح "یک طرفہ کارروائی" نہیں ہیں۔ تفصیل سے دامن بچاتے ہوئے اس مثنوی سے چند اقتباسات پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

"محمد عادل شاہ کے مرنے اور علی عادل شاہ کی تخت نشینی پر ملک کی کیا حالت تھی۔۔۔ نصرتی نے جو کچھ لکھا ہے، تاریخوں سے اس کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے"۔(۲۲)

نھنے ھور بڑے تھے سو سب بد نہاد اچاھے وہ چارو طرف تھے فساد
مخالف تو اکثر منافق ھوئے موافق بھی کے نا موافق ھوئے
بڑی دیج کی شہ، اپنے کم سن منے نوی بادشاھی، نوے دن منے

علی نامہ میں مغلوں کی بےوفائی کا ذکر ہے۔ مغل سپاھیوں کا نصرتی نے اس حقارت سے تذکرہ کیا ہے۔

یہ آتے سو اکثر ھیں وہ پوت عاق جو نیچے ھیں ماوان لے پر طلاق

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ اعتراف بھی کرتا ہے۔

مغل ہر ہنر میں بڑا کار ساز　　لڑائی کے فن پر تو ات حیلہ ساز

اور

کہ ہر مرد جیوں کوہ البرز ہے　　تبر کس کے ہت، کس کے جم گرز ہے

علی نامہ میں باہمی معرکوں کی ہر تفصیل موجود ہے، مگر دکنی نقطۂ نظر سے۔ وہ جے سنگھ اور مغلوں کی فتح کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ دکنی اتحاد کا موضوع اسے عزیز ہے۔ جب سلطان عبد اللّٰہ قطب شاہ نے اپنی فوجیں نیک نام خاں کی سرکردگی میں علی عادل شاہ کی امداد کے لئے بھیجیں تو مغلوں پر ان دونوں لشکروں کے حملہ کا بیان وہ جوش و خروش سے کرتا ہے۔

قلعۂ پورندہ کے معرکہ میں نصرتی نے بیجاپوری لشکر کی بہادری کی بہت تعریف کی اور جب جے سنگھ نے اس قلعہ پر قبضہ کیا تو نصرتی نے اسے "اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے" سے تعبیر کیا۔

تو فرصت مغل پا کیا گڑ کوں زیر　　کہ اندے نے جوں چانپ پکڑیا بٹیر

نصرتی نے شیوا جی کا ذکر بھی شدت اور تلخی سے کیا ہے۔ وہ اس کے نزدیک کفر میں فرنگی سے زیادہ شدید تھا۔

ع　فرنگی تھے تھا کفر میں ات اشد

اس مصرع کے تاریخی اور فکری پہلو پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اور آگے چل کر نصرتی نے شیوا جی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا قتل تو حرم میں بھی جائز ہے۔

ع　حرم میں بھی سنپڑے تو تھا کشتنی

لیکن اپنی دکنی قومیت کے جوش میں نصرتی نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ دکن پر اورنگ زیب کی مسلسل فوج کشی کا اصل سبب مرہٹہ فتنہ کا استیصال تھا۔ دکن کی مسلمان ریاستیں، شیوا جی کے لئے جائے پناہ بن گئی تھیں۔

تہذیبی اعتبار سے اس دور کے شاعروں میں ہاشمی کا ذکر بھی بعض رجحانات

کو سمجھنے مین مدد و معاون ہوگا۔ بعض نقادون نے ہاشمی کو اردو کا پہلا باقاعدہ ریختی گو شاعر قرار دیا ہے جس نے اپنا دیوان ریختی بھی مرتب کیا ہے۔ دوسری طرف پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفی خان نے مولانا عبد السلام ندوی اور پروفیسر مسعود حسن رضوی وغیرہ سے اتفاق کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ "ایسی شاعری کا شمار بھاشا مین ہوگا جس مین عورت کا خطاب مرد سے ہے۔۔۔ کیونکہ ریختی مین عورتون کے جذبات، خیالات اور احساسات کے علاوہ ان کی زبان اور اصطلاحات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور ساتھ ہی عریانی کی جھلک بھی آ جاتی ہے"۔(۲۳) اس مطالعہ کے ابتدائی حصہ مین افضل کے بارہ ماسہ کے سلسلہ مین اسی خیال کی تائید کی جا چکی ہے۔ بھاشا کے اثر کے علاوہ مجاز اور تمثیل کے پردون سے فائدہ اٹھانے کے لئے صوفیائے کرام نے بھی اپنی شاعری مین اس اسلوب سے کام لیا ہے۔ اس کی ایک مثال تو خود "خاکی" کی شاعری ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے مندرجہ بالا رائے کا اظہار کیا ہے۔ دیوان ہاشمی کے مقدمہ مین ڈاکٹر حفیظ قتیل نے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "صوفیا نے عورتون کو تعلیمات دین اور اسرار معرفت سمجھانے کے لئے چکی نامہ، چرخہ نامہ اور شادی نامہ عورتون کی زبان مین لکھے"۔(۲۴) اس ضمن مین یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عورتون کو سمجھانے کے علاوہ تانیث کے صیغہ مین جو عاشقانہ گداز اور خود سپردگی ہے وہ ایک عشقیہ فضا کی تخلیق مین فنی طور پر مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ہاشمی کی شاعری اگر ایک طرف بھاشا کی سنجیدہ عشقیہ شاعری کی روایت کو پیش کرتی ہے تو دوسری طرف اس مین "عورتون کے جذبات، خیالات اور احساسات کے علاوہ ان کی زبان اور اصطلاحات کا خاص لحاظ" رکھا گیا ہے اور "ساتھ ہی عریانی کی جھلک" بھی آ گئی ہے۔ اس عریانی کو جنسی معکوسیت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ہاشمی کی شاعری مین شمالی ہند کی ریختی کی خصوصیات اپنی ابتدائی شکل مین ملتی ہین۔ عورتون کی "زبان اور

اصطلاحات" کے بارے میں ان کا دعویٰ یہ ہے۔

مرا کیا یار چنچل ہے کتی ہے ریجھ کر جو تو

دئیے ہیں ہاشمی عزت ہماری "اوئی" کی بولی کون (کذا)

ہاشمی کے دیوان سے اس عہد کی خواتین کے لباس، زیورون اور آرائش کے سامان وغیرہ کی فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ اس طرح شمالی ہند کی ریختی کی طرح ہاشمی کے کلام میں نسوانی محاورون اور اشارون کی فراوانی ہے، مثلاً پیٹھ مارنا، سر نہانا، روکھا پانی نہانا، میلی ہونا، چلچلی، فضیحی وغیرہ۔

رہی بات عریانی اور معکوس جنسی جذبات کی، سو اس کا اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے جن میں بیاہتا اور کنواری عورتون نے اپنے جذبات و کیفیات کو بیان کیا ہے۔ دیوان ہاشمی میں ایسے اشعار کثرت سے موجود ہیں۔

نادان ہون میں چھوری، کرتے ہیں کیا زوری

ذرا نہیں صبوری کیسے تمہیں چپو خون (کذا)

(بیاہتا عورت اپنے آشنا سے)

ہر یک فن کر کے لائی ہون تمین چپ اس کا بت پکڑو

دو ہت پکڑے پہ چپ رہی تو بزان بیشک سینہ رگڑو (کذا)

(کٹنی مرد سے)

ان جنسی معاملات و مسائل کے ساتھ ساتھ اس عہد کی سیاست کے بارے میں بھی ہاشمی کے اشعار میں واضح اشارے اور تبصرے ملتے ہیں۔ خاص بات یہ کہ وہ ذاتی باتون کے اظہار کے لئے سیاسی واقعات کو تشبیہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، مثلاً

کالی دھڑی میں دھن تری بیٹھا ہے میرا جیو سو یون

بیٹھا ہے کرناٹک میں جون سکہ سو "عالم گیر" کا

قطب شاهی عہد (۱۵۰۸ء سے ۱۶۸۷ء تک)

شعر و سخن کے لحاظ سے اس خاندان کے پہلے چار بادشاہون سلطان قلی، جمشید قلی، سبحان قلی اور ابراہیم قلی کا زمانہ زیادہ اہم نہین ہے۔ یہ استحکام سلطنت مین مصروف رہے۔ ابراہیم کے دور کے جن شاعرون کے نام ادبیات دکن کی تاریخون مین ملتے ہین ان مین "فیروز" سب سے اہم معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا کلام دستیاب نہین ہو سکا، لیکن وجہی اور ابن نشاطی نے اس کی خدمت مین جس انداز سے خراج تحسین پیش کیا ہے، اس سے اس کے شاعرانہ رتبے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس مطالعہ کے موضوع کے مطابق اس خاندان کا سب سے اہم شاعر محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) ہے جسے اردو کے پہلے صاحب کلیات شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس نے کم و بیش پچاس ہزار بیت کہے، جیسا کہ اس کے جانشین نے کلیات کے منظوم دیباچہ مین کہا ہے۔

ع مگر شاہ کہہ بیت پچاس ہزار

قلی قطب شاہ کے کلیات کے مطالعہ سے "ظل اللّٰہ" (تخلص شاہ) کے موضوعات کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ "متعدد مثنویان پھلون اور میوؤن پر ہین جن مین ایران اور خراسان ہی کے میوے نہین بلکہ ہندوستان کے ہر قسم کے پھلون کا بیان کیا گیا ہے، یہان تک کہ بڑ کی بڑولی، بنولی، منجل، گینگل، سیندولے کو بھی نہین چھوڑا --- بہت سی مثنویان اور غزلین ایسی ہین جو شاعر نے اس وقت کے رسم و رواج اور تیوہارون مثلاً شادی کی رسوم، اپنی سالگرہ، شب برات، میلاد نبیؐ، عید غدیر، سوکا، برسات، ہولی، بسنت، پان اور اپنے ہاتھی پر لکھی ہین"۔(۲۵)

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری اگر ایک طرف اس کے تعیشات اور ذاتی معتقدات کی داستان ہے تو دوسری طرف اس عہد کی تمدنی اور کسی حد تک سیاسی تاریخ بھی ہے۔ قلی قطب شاہ سخت شیعہ تھا۔ عیش و عشرت مین بھی

مذہب کے پہلو کو فراموش نہ کرتا۔ اس نے اپنی محبوباؤں پر جو نظم لکھی ہے اس کا عنوان "بارہ پیاریاں" ہے۔ "محمد قلی بارہ اماموں کی رعایت سے ہر چیز میں بارہ کے عدد کا لحاظ رکھتا تھا"۔(۲۶) محل کوہ طور میں اس نے بارہ برج بنوائے۔

بارہ بروج پر ہے بارہ امام دشٹی تو اس اپر جھلکتا، ایمان کا اجالا

یہی مذہبی اثرات تقریبات اور تمدنی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں۔ "مولود علیؓ" اور "عید غدیر" کو سرکاری تقریبات کی حیثیت حاصل تھی۔ محمد قلی سے پہلے قطب شاہیوں نے کبھی اپنے عقائد کی تبلیغ نہیں کی تھی، لیکن اس حکمران نے مذہبی مخالفتوں کو جنم دیا۔

ہمیں ہیں شیعہ کر کرتے خوارج دشمنی سب سوں
علی ابن ابی طالب انں کوں مارو ہت ضربت

ڈاکٹر زور نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دکن میں خارجیوں کے وجود کا کبھی پتہ نہیں چلتا، اسی لئے خوارج سے مراد غالباً سنی ہیں۔(۲۷)

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دور کی تقریبات سے اس عہد کے کلچر اور تمدنی مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس نے ان ساری تقریبات پر نظمیں لکھ کر آنے والے ادوار کے مورخوں کے لئے راہ ہموار کر دی۔ "عید غدیر" اور "مولود علی" شیعی اثرات کی آئینہ دار ہیں۔ "عید"، "عید میلادؐ" اور "شب برات" کی تقریبات تمام مسلمان مل کر مناتے تھے۔ "بادشاہ کی سالگرہ" بھی سرکاری تقریب تھی۔ یہ شاہ پرستی کے عنصر کا ثبوت ہے۔ اس تمدن کا ایک اور اہم عنصر موسم ہے۔ ہولی، بسنت وغیرہ کے علاوہ بارش اور برسات پر اس نے اور اس کے دوسرے ہم عصر یا بعد کے شعرا نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مرگ سال کو محمد قلی نے قومی تہوار بنا دیا تھا۔(۲۸) موسم کے تہواروں میں نوروز کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو ایرانی اثرات کی غمازی کرتا ہے، لیکن موسم سے متعلق تہواروں میں

سب سے زیادہ اہمیت مرگ سال کو دی جاتی تھی۔ یوں تہواروں میں بھی دکنی عنصر سب سے قوی بن گیا۔ ڈاکٹر زور کے الفاظ میں "دکن میں جس روز بارش شروع ہوتی ہے اسے آج بھی مرگ کا دن کہتے ہیں اور مرگ لگنا یعنی بارش شروع ہونا ایک قومی تہوار ہے"۔(۲۹) ڈاکٹر زور کی عبارت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے جداگانہ تمدن کا احساس دکن والوں کو صدیوں سے ہے اور ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب "سلطان محمد قلی قطب شاہ" میں اسی تمدن کو "گول کنڈہ کا بین قومی تمدن" کہا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی زندگی اور تعمیرات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے طوالت کی وجہ سے نظر انداز کرتے ہوئے اس کی رزم آرائی سے متعلق چند اشارے پیش کئے جاتے ہیں۔

رام راج کا جانشین ونیکٹ پتی راج علی خاں کی بغاوت میں شریک ہو گیا تھا۔ اس سے وجیانگر والوں کی ہمت بڑھ گئی۔ محمد قلی نے ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۵ء) میں قلعۂ پنکنڈہ کا محاصرہ کر لیا اور قلعہ والوں کو تین دن کی مہلت دی جسے قلعہ والوں نے قلعہ کے انخلا کی جگہ فوجی تیاریوں اور قلعہ بندی کے لئے استعمال کیا۔ بارش کے شدائد کی وجہ سے محمد قلی قطب شاہ کو واپس لوٹنا پڑا۔ اس سے ونیکٹ پتی کی ہمت بڑھ گئی۔ کئی چھوٹے بڑے معرکے ہوئے۔ کبھی کبھی تو ہندو فوجیں سلطنت کی سرحد میں گھس آتیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر محمد قلی نے اپنے عساکر سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

محمدؐ دین قائم ہے، ہندو بھاراں بھگا دو تم
سیاہی کفر کی بھانو، اجالا جگمگا دو تم
اجالے دین میں فوجاں جو آویں ڈاٹ کر غم کی
تو حیدر کی کٹاریاں سوھیا ان کا چرا دو تم

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا سب سے مشہور شاعر اور ادیب وجہی

ہے۔ ایک طرف تو اس کے نثری کارنامہ "سب رس" میں تمثیل سے قطع نظر، ناول کے ابتدائی خد و خال ملتے ہیں اور دوسری طرف اس کی مثنوی قطب مشتری (۱۶۰۹ء) میں بادشاہ کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی سے اس معاشرہ کی اخلاقی اقدار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں عشق کو "گناہ ابن آدم" نہیں بلکہ توفیق سمجھا جاتا تھا۔ دکن کی عظمت اور ایک علیحدہ ملک ہونے کا احساس گول کنڈہ کے پہلے ملک الشعرا وجہی کو شدت سے تھا۔

دکھن ہے نگینہ، انگوٹھی ہے جگ　　انگوٹھی کون حرمت نگینہ ہی لگ
دکھن ملک بہو تیج خاصہ اہے　　تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۵ء) محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا۔ اس کے منظوم دیباچۂ کلیات محمد قلی قطب شاہ کا حوالہ آ چکا ہے، مگر شاعر ہونے کے باوجود وہ شعرا کا قدردان نہ تھا۔ بہت سے شاعروں کا رشتہ دربار سے ٹوٹ گیا تھا۔ غواصی اس عہد کا مشہور شاعر ہے اور "سیف الملوک و بدیع الجمال" اس کی مشہور مثنوی ہے۔

عبد اللّٰہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء تا ۱۶۷۲ء) نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ادب نوازی کی روایات کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ وجہی، غواصی اور دوسرے شاعر شاہی دربار کی زینت بن گئے۔ وجہی نے دربار میں اپنی واپسی کا ذکر سب رس کے دیباچہ میں کیا ہے۔ غواصی نے طوطی نامہ میں عبد اللّٰہ کے عہد کو غرق شدہ فن کاروں کے دوبارہ ابھرنے کا دور قرار دیا ہے۔

ڈوبے تھے ہنر مند سو پھیر کر　　نکل آئے تجھ دور میں تیر کر
دیا جیو پھر راگ ہور رنگ کون　　کیا دور سینہال پو کے زنگ کون

جنیدی اور ابن نشاطی بھی اسی عہد کے شاعر ہیں۔ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ علم و فن کے دوسرے شعبوں کی سرپرستی بھی عبد اللّٰہ قطب شاہ نے کی۔ علامہ نظام الدین کی کتاب حدیقۃ السلاطین اسی زمانہ میں لکھی گئی۔

عبد اللّٰہ قطب شاہ خود بھی شاعر تھا اور اپنے نانا کی طرح متنوع اور مختلف پہلوؤں اور موضوعات کو اس نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ عبد اللّٰہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ اس کے عہد کے تمدن کی نہج اس کے نانا کے دور سے مختلف نہیں تھی۔ ایک طرف مجالس میلاد و مجالس عزا اور دوسری طرف بزمہائے عیش و عشرت، بسنت، نوروز اور دوسری تقاریب بھی پہلے کی طرح منائی جاتیں۔ عبد اللّٰہ قطب شاہ "عید غدیر" بڑی شان سے مناتا تھا، کیونکہ شیعی عقیدہ کے مطابق عید غدیر کے دن علی کے نام خدا نے خلافت بھیجی اور اسی لئے یہ عید شیعوں کے لئے عید کبیر ہے۔(۳۰)

اے مومناں خوشیاں کے چشمیاں کوں نیر آیا
یعنی جہاں میں سر تھے عید غدیر آیا

سلطان عبد اللّٰہ قطب شاہ کے سلسلہ میں یہ بات کہنی مناسب ہوگی کہ عید غدیر، مولود علی اور مجالس محرم کے ساتھ ساتھ وہ عید میلاد النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا اہتمام بھی بڑے خلوص اور شان سے کرتا تھا۔

اس پس منظر میں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ عبد اللّٰہ قطب شاہ کی نعتیہ شاعری میں رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں یوم میلاد النبی کا ذکر بار بار کیوں کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ ہر سال وہ اس جشن کے موقع پر خصوصی نظمیں اور نعتیں کہتا ہو۔ نمونے کے طور پر تین شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

لکھ فیض سوں پھر آیا دن دین محمدؐ کا
آفاق صفا پایا دن دین محمدؐ کا

یو عید ہمیں ساجے، نصرت کے بجیں باجے
ہے جگ کے نبی راجے، دن دین محمدؐ کا

---

نبی مصطفی کا جو مولود آیا　　جہاں صاف ہو سربسر جگمگایا

عبد اللّٰہ قطب شاہ کے آخر دور میں گول کنڈہ پر اورنگ زیب عالم گیر کے حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مرہٹہ فتنہ کو کچلنے کے لئے یہ قدم ناگزیر تھا۔ ۱۶۶۶ء میں عبد اللّٰہ قطب شاہ اور مغلوں کے درمیان صلح ہوئی۔ یہ صلح قطب شاہی اقتدار کے خاتمہ کا اعلان تھی۔ اس کے بعد عبد اللّٰہ نے اپنی مہر بنوائی "ختم بالخیر و السعادۃ"۔(۳۱) گویا یہ مہر اس خاتمۂ اقتدار کی توثیق تھی۔

۱۶۷۲ء میں ابولحسن تانا شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کے مزاج کی نزاکت یا انفرادیت کا اندازہ "تانا شاہ" کے ٹکڑے سے ہو سکتا ہے۔ اس عہد کے قابل ذکر شاعروں میں طبعی اور محب شامل ہیں۔ محب، شاہ راجو کا مرید تھا اور اس طرح ابولحسن تانا شاہ کا "پیر بھائی" تھا۔ تانا شاہ کا مسلک اپنے اسلاف سے مختلف تھا۔ محب نے مثنویٔ معجزۂ فاطمہ (۱۶۷۷ء) میں ابوالحسن تانا شاہ کی مدح میں اپنے پیر اور ان کے جد بزرگوار خواجہ گیسو دراز کی حمایت و نصرت روحانی کا ذکر کیا ہے۔

کہ اے نامور قطب شاہ بولحسن　　عطا تجھ کئے پیر تخت دکن

تجھے پیر کا حق تے سایہ اہے　　تو ہر کام میں فتح پایا اہے

محمد حسینی دئیے تج کوں راج　　مبارک اچھو تج کو یوتخت وتاج

محب نے صرف "پیر" کا لفظ استعمال کیا ہے اور پھر اس سلسلہ کے نامور بانی (دکن میں) کا نام نظم کیا ہے۔ طبعی نے شاہ راجو کی صراحت کر دی ہے۔

شہ بولحسن سچ توں شاہ دکن　　تجھے شاہ راجو مدد بولحسن

دیا ہے خدا بادشاہی تجھے　　سہاتا ہے ظل الہی تجھے

ابولحسن تانا شاہ کے ساتھ قطب شاہی دور ختم ہوا۔ اور یوں مغل دور کا آغاز ہوا۔ مغل دور کا تذکرہ کرتے ہوئے عہد حاضر کے دکھنی ادبی مورخوں

کے لہجہ میں بالعموم ایسی تلخی آ جاتی ہے جو ہمارے "تصور قومیت" کے نظریہ کی تائید کرتی ہے۔ مثلاً اس عہد کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے لکھا ہے۔

"گیارھویں صدی کے آخری دو چار سالوں۔۔۔ میں دکن ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس نے اس سر زمین کی تہذیب و شائستگی اور علم و فضل کی بنیادیں ہلا دیں"۔(۳۲)

ڈاکٹر زور کے رائے یہ بھی ہے کہ اس عہد کے شاعروں نے امام حسین کے مرثیوں کے پردے میں اپنے وطن کے مرثئے لکھے ہیں۔ یہ رائے بھی بڑی حد تک ایک "قومی اور ذہنی عصبیت" پر مبنی ہے۔ جیسا کہ مطالہ کیا جا چکا ہے شیعیت کے زیر اثر دکن کی مسلم ریاستوں میں مجالس عزا برپا ہوتی تھیں اور مرثیہ مقبول عام صنف سخن کا درجہ رکھتا تھا۔ ویسے ڈاکٹر زور کے نقطۂ نظر میں صداقت کا ایک عنصر ضرور ہے۔ بعض مرثیوں کی عمومیت اور لہجے سے ان کی رائے کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن یہ عمومیت تمام مرثیوں میں نہیں ہے۔

آج غم ناک ہیں چمن کے گل　　بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غم زدہ سینہ داغ حیران ہیں　　نرگس و لالہ، یا سمن کے گل

قطب شاہی حکومت کے خاتمہ نے دکنی قومیت میں بھی شگاف ڈال دئے۔ بہت سے مذہبی شاعر قومیت کے اسیر نہیں تھے اور یہ شاعر ہمیں اورنگ زیب کے مدح خواں نظر آتے ہیں۔ ضعیفی نے اپنی مثنوی میں اورنگ زیب کی مدح لکھی ہے۔ مثنوی کا سال تصنیف ۱۶۸۸ء ہے۔

یہ دور جہاں دار اورنگ زیب　　کہ جس کے ہوا اس زمانے کون زیب
شہنشاہ عادل اہے در امور　　کہ بدعت ضلالت ہوا جس سے دور

---

کہ شاہان بھی اول ہوئے ہیں تو کیا　　نہ کوئی زہد و تقویٰ میں ایسا دیسا

بڑا دین اسلام کا کار ساز　　الٰہی تون کر عمر اس کی دراز

شیخ داؤد ضعیفی کے ان اشعار کے متعلق قطعیت سے یہ بات نہین کہی جا سکتی کہ یہ پہلی مدح ہے جو کسی حیدر آبادی (دکنی) شاعر نے اورنگ زیب کی لکھی۔(۳۳) پہلی وجہ یہ ہے کہ ایسے کسی بھی انقلابی دور مین بہت سے شعرا کا کلام ضائع ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اس دور کے دوسرے دکنی شعرا کا کلام ہمین عالم گیر کی مدح میں ملتا ہے۔ ۱۶۸۵ء مین قاضی محمود بحری بیجاپور کے دور آخر مین وہان پہنچے۔ قاضی محمود بحری نے زوال کے آثار، شان و شوکت اور عیش و عشرت کے پردون سے جھلکتے دیکھ لئے۔ مثنوی من لگن کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

ارے بھائی یہ بارھوین صدی ہے　　نیکی کو دبا بدی بدی ہے
دھرتی پہ ادھرم ادھک ہوا ہے　　امرت کی بجائے بکھ ہوا ہے
اک جیو پہ درد دین کا نین　　اک دل پہ اثر یقین کا نہین
نا جائے کو مائی کا بھروسا　　نا بھائی کو بھائی کا بھروسا
نا شرم کی خو ہے یک نین مین　　نا دھرم کی بو ہے یک بدن مین

ان حالات مین جب زمین پر بے دینی پھیلی ہوئی ہو، کسی دل مین دین کی تڑپ اور درد نہ ہو، سینے سوز یقین سے خالی ہون، اورنگ زیب کی ذات ایسے احساس رکھنے والے شاعر کے لئے یقیناً مثالی حیثیت حاصل کر لیتی۔ بحری کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ "من لگن مین ایک فصل شہنشاہ اورنگ زیب کی مدح مین بھی ہے۔۔۔ بحری نے اورنگ زیب کی بہت تعریف کی ہے"۔(۳۴)

اک ملک نین جو ان لیا نین　　اک نفل نین جو ان کیا نین
ایسا نہ ہوا کسی شہان مین　　نا بلکہ بڑی مشائخان مین
جس ناون اہے ابوالمغازی　　سلطان اورنگ زیب غازی

دیندار، دلیر اور دانا　　یک علم نا سب منے سیانا

اورنگ زیب کی مدح کے ساتھ ساتھ بحری کے یہاں حب وطن کے جلوے ھین، ھاں تنگ نظر قومیت نہین ھے۔ بحری اپنے اور دکن کے تعلق کو نل اور دمن کے تعلق سے تشبیہ دیتے ھین۔

بحری کون دکھن یون ھے کہ جیون نل کون دمن ھے
پس نل کون ھے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

بیجاپور اور گول کنڈہ کی فتح کے بعد دکنی ادب کا نیا دور شروع ھوا جسے مغل دور قرار دینا چاھئے۔ اس دور کے آغاز کو ایک ادبی مورخ نے ایسا انقلاب قرار دیا جس نے "تہذیب و شائستگی اور علم و فضل کی بنیادین ھلا دین"۔ یہ حوالہ گزشتہ صفحات مین پیش کیا جا چکا ھے۔ یہ تصویر ایک رخی ھے۔ "دکن مین اردو" کا مصنف زیادہ حقیقت پسند ھے۔ اس دور کے بارے مین اس نے لکھا ھے۔

"پہلے قطب شاھی پائے تخت گول کنڈہ اور عادل شاھی دارالحکومت بیجاپور شاعری کے مرکز تھے تو اب مغلیہ دور مین اورنگ آباد نے اس کی جگہ لے لی۔ اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنت مغلیہ کا مستقر ھونے کے لحاظ سے دھلی کے امرا، روسا، علما اور شعرا کا مرکز بن گیا بلکہ گول کنڈہ اور بیجاپور کے باکمالون کا بھی ملجا ٹھہر گیا۔ شعر و شاعری کا چرچا بڑھا"۔(۳۵)

شمالی ھند مین اردو شاعری کا سلسلہ تو پہلے ھی شروع ھو چکا تھا جیسا کہ اس مضمون کے ابتدائی حصہ مین عرض کیا گیا ھے، لیکن اورنگ زیب کے عہد تک شمالی ھند مین اردو شاعری کی رفتار کا دکن سے مقابلہ نہین کیا جا سکتا۔ شمالی ھند (اور بالخصوص دھلی) اٹھارھوین صدی عیسوی کی دوسری دھائی سے اردو شاعری کا مرکز بننے لگا۔

اس مضمون کا اختتام میر جعفر زٹلی کے ظفر نامۂ اورنگ زیب شاہ پر کرنا مناسب ھوگا۔ میر جعفر زٹلی مختلف شہادتون کی بنا پر عہد فرخ سیر تک زندہ رھے۔

ان کا نام ھی ان کے طرز کلام پر تبصرہ ھے، لیکن وہ "زٹل گو" ھونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے مبصر بھی ھین۔ نوکری پر ان کی نظم یا ان کی شکایت روزگار آج بھی محض تاریخی اھمیت نہین رکھتی بلکہ اس مین ادبی چاشنی بھی ھے۔ جعفر زٹلی نے شاید ھی کسی کو بخشا ھو۔ کوتوال سے شہزادے اور شہنشاہ تک سب ان کے تیغ قلم سے گھائل ھوئے، مگر مجموعی طور پر عالم گیر کی شخصیت کے سامنے انہون نے بھی سر جھکایا۔ عالم گیر کے باب مین ایسے آدمی کا احساس ذمہ داری "ھمارے ترکش کے آخری تیر" کی عظمت کا ایک اور ثبوت ھے۔ اورنگ زیب کی دکنی فتوحات کا ذکر کرتے ھوئے میر جعفر زٹلی اپنے ظفر نامہ مین کہتے ھین۔

زھے شاہ اورنگ دھانک بلی — کہ در ملک دکن پڑی کھل بلی
درین پیر سالی و ضعف بدن — مچائی دھما چوکڑی در دکن
بر آورد عسکر بصد دھوم دھام — کہ ھل چل پڑی برسر روم و شام
کمر بستہ، ھشیار، میدان پر — شب و روز تیار گھمسان پر

## حوالے


(۱) حافظ محمود شیرانی پنجاب مین اردو (طبع چہارم)، لاھور، صفحہ ۶۸-۱۶۷

(۲) کبیر کے مستند حالات کی ترتیب کا کام اب تک نہین ھو سکا ھے۔ وسکٹ نے سال پیدائش ۱۳۹۸ء اور سال وفات ۱۵۱۸ء بتایا ھے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے پیدائش ۸۴۰ھ کے قریب لکھی ھے، یعنی عیسوی تقویم کے مطابق کبیر ۱۴۳۶ء کے قریب پیدا ھوے۔

(۳) پنڈت منوھر لال زتشی کبیر صاحب الہ آباد، ۱۹۳۰ء، صفحہ ۱۳۰

(۴) حوالہ بالا صفحہ ۶۸

(۵) حافظ محمود خان شیرانی پنجاب مین اردو صفحہ ۲۱۲

(۶) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، فارسی پر اردو کا اثر (طبع اول)، ۱۹۵۲ء، صفحہ ۳۲

(۷) حافظ محمود خان شیرانی، پنجاب مین اردو

(۸) Gettell, R.G.-*History of Political Thought*, pp. 423-4, 15th mpression, George Allen & Unwinn Ltd, London, 1951.

(۹) حوالۂ بالا، صفحہ ۴۲۶

(۱۰) حوالۂ بالا، صفحہ ۴۲۷

(۱۱) Barbara Ward, *Five Ideas That Changed the World*, London, 1959.

(۱۲) حکیم سید شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم (طبع دوم)، کراچی، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۶۲

(۱۳) حوالۂ بالا، صفحہ ۶۳

(۱۴) ویسے اس مضمون مین انہون نے بہمنی سلطنت کا سال قیام ۱۳۴۷ء لکھا ہے اور دکنی ادب کی تاریخ مین ۱۳۵۰ء۔

(۱۵) ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ادبی تحریرین، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۵۸

(۱۶) ڈاکٹر محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، کراچی، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۸

(۱۷) حوالۂ بالا، صفحہ ۳۲

(۱۸) مولوی عبد الحق، قدیم اردو (اشاعت اول)، کراچی، ۱۹۶۱ء، صفحہ ۸۵

(۱۹) سید مبارز الدین رفعت، دیباچہ کلیات شاہی، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۲ (نیز مولوی عبد الحق "نصرتی" مین)

(۲۰) مبارزالدین رفعت، دیباچہ کلیات شاہی، صفحہ ۴۶

(۲۱) مولوی عبد الحق، نصرتی (طبع اول)، علی گڑھ، صفحہ ۸۲

(۲۲) حوالۂ بالا، صفحہ ۱۰۶

(۲۳) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، علمی نقوش، کراچی، ۱۹۵۷ء، صفحہ ۵۴

(۲۴) ڈاکٹر حفیظ قتیل، دیوان ہاشمی۔مقدمہ (طبع اول)، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۱ء، صفحہ ۲۰

(۲۵) مولوی عبد الحق، قدیم اردو، صفحہ ۸۵

(۲۶) ڈاکٹر محی الدین زور، سلطان محمد قلی قطب شاہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۰ء، صفحہ ۶۰

(۲۷) حوالۂ بالا، صفحہ ۹۶ اور ۹۷

(۲۸) نصیرالدین ہاشمی، دکھنی کے چند تحقیقی مضامین (طبع اول)، دھلی، ۱۹۶۳ء، صفحہ ۱۱۹

(۲۹) ڈاکٹر محی الدین زور، ادبی تحریرین، صفحہ ۶۸ (نیز سلطان محمد قلی قطب شاہ، صفحہ ۲۱۶)

(۳۰) نصیر الدین ہاشمی، دکھنی کے چند تحقیقی مضامین، صفحہ ۱۱۵

(۳۱) ڈاکٹر محی الدین زور، دکنی ادب کی تاریخ، صفحہ ۸۷

(۳۲) حوالۂ بالا، صفحہ ۱۰۰

(۳۳) حوالۂ بالا، صفحہ ۱۱۰

(۳۴) ڈاکٹر محمد حفیظ سید، دیباچہ کلیات بحری (طبع اول)، ۱۹۳۸ء، صفحہ ۵۴ اور ۵۵

(۳۵) نصیرالدین ہاشمی، دکن مین اردو، لاھور، ۱۹۵۲ء، صفحہ ۲۴۸